قرآن مجید کا تصور انسان

نسیم ظہیر اصلاحی

دورِ جدید کا انسان اپنی فطری قوتوں اور وہبی صلاحیتوں سے کام لے کر مخلوقات ارضی پر حکمرانی کر رہا ہے۔ ہواؤں میں اڑنا اور فضاؤں میں تیرنا اس کا معمول ہے۔ اب وہ سطح زمین سے اٹھ کر عالم بالا کی شہ نشینی کا خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن اس محیّر العقول ترقی و پرداز کے باوجود، انسان خود اپنی ذات اور اس کے مرتبہ و مقام سے ناواقف ہے۔ ڈارون نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان حیوانیت کی ایک ارتقائی کڑی ہے۔ طبعی قوانین کے زیر اثر دنیا میں حیات نمودار ہوئی، جس نے بالآخر انسان کی شکل میں ظہور کیا۔ کوئی کہتا ہے: انسان ایک وحشی ہے البتہ اسے سدھایا جا سکتا ہے۔ تو کوئی ایک انسان کو دوسرے انسان کے لیے بھیڑیا قرار دیتا ہے۔ کسی نے انسان کو بدمعاش اور بدطینت کہا تو کسی نے اسے پیدائشی گنہگار بتایا۔

مسئلہ ارتقا جسے عصر حاضر میں سب سے زیادہ شرف قبول حاصل ہے، انسان کو نرا حیوان بنا کر انسانی زندگی کو بے مقصد حیوانی کشمکش قرار دیتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک انسان کا دوسرے انسان سے تعلق، محبت و اخوت کا نہیں بلکہ حیوانیت اور بہیمیت کا ہے۔ انسان اور انسان کے باہمی تعلق کو دور حاضر کے جس تصور نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا وہ ''بقائے اصلح'' کا اصول ہے۔ اس کے مطابق حیاتیات کے دائرہ میں جو کشمکش اور تنازع للبقاء ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کمزور مٹ جائیں اور طاقت ور باقی رہیں اور پھلیں پھولیں۔ مختلف مذاہب اور جدید سیکولر فکر نے انسان کے تعلق سے جو غلط بنیادیں فراہم کی ہیں، اس کے نتیجہ میں انسان نے انسان کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ بڑا بھیانک اور خوف ناک ہے اور موجودہ منظرنامہ بھی پہلے سے کم ہیبت ناک اور وحشت ناک نہیں ہے۔

اس صورت حال نے صالح مزاج، نیک طینت اور ہر شریف النفس انسان کو ایک ذہنی

کشمکش اور الجھاؤ میں مبتلا کردیا ہے۔ فکر و اخلاق کے میدان میں زندگی کی شاہراہ اس کے سامنے واضح نہیں ہے۔ وہ فکری پراگندگی اور ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ وہ نت نئے سماجی و معاشرتی مسائل اور پیچیدگیوں میں الجھا ہوا ہے۔ وہ اپنے ان مسائل کا حل اور فساد و بگاڑ کی اصل تک پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ مضطرب اور پریشان ایک بہتر اور پرسکوں دنیا کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ لیکن اسے منزل کا سراغ ملتا نظر نہیں آرہا ہے۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک اس کا وہ فاسد اور خام نظریہ ہے جو اس نے انسان کے متعلق قائم کر رکھا ہے۔ انسان کا وہ تصور جو فکر جدید کے حاملین نے پیش کیا ہے، وہ بالکل غیر متوازن اور منفی نوعیت کا ہے۔ اور ظاہر سی بات ہے کہ جب تہذیب و تمدن کی بنیاد کسی غلط تصور اور غیر متوازن فکر پر رکھی جائے تو اس پر تعمیر ہونے والی عمارت کتنی ہی عالی شان کیوں نہ ہو، بنیاد کی کجی اور خامی کی وجہ سے اسے قرار و استحکام ہرگز حاصل نہ ہوگا۔

اس غیر متوازن اور منفی تصور انسان کے برعکس قرآن مجید نے، انسان کا ایک نہایت متوازن اور مثبت نظریہ پیش کیا ہے اور یہ اسی کا شرف و امتیاز ہے کہ انسان اور اس کی عظمت کا نہایت پاکیزہ اور بلند تصور اس نے اس وقت پیش کیا جب ان بنیادوں پر سوچنے کا شعور بھی کم ہی تھا۔ زیر نظر مضمون میں قرآن مجید کے بیان کردہ تصور انسان کو پیش کرنے کی ایک طالب علمانہ کاوش ہے، تاکہ دور جدید کے انسانوں کے سامنے ایک ایسا آئینہ آجائے، جس سے ان کو اپنے ان مسائل کا حل تلاش کرنے میں آسانی اور سہولت ہو جن میں وہ الجھا ہوا اور پریشان ہے۔

قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جس کا مخاطب صرف انسان ہے، اس کی ساری بحث انسانیت سے ہے۔ اس نے کسی موقع پر بھی فرد کو اپنا مخاطب نہیں بنایا ہے، بلکہ ہمیشہ انسان، انسانیت اور گروہ ابن آدم کو اپنا مخاطب قرار دیا ہے۔ اس نے انسان کے بارے میں نہایت واضح اور متعین نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔

قرآن مجید نے انسان کی اصل و حقیقت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ دنیا میں اس کی حیثیت اور مرتبہ و مقام کیا ہے؟ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس وسیع و عریض کائنات میں وہ کس مقصد سے آیا ہے؟ یہاں اس کی مسئولیات اور اختیارات کیا ہیں؟ اس کو بھی اس نے واضح اور متعین کردیا ہے۔

انسان کی حقیقت

قرآن مجید کے مطابق انسان کسی حادثہ کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ اس کی تخلیق ایک خاص ارادہ ومنصوبہ کے تحت بڑے اہتمام کے ساتھ عمل میں آئی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَإِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلائِکَةِ إِنِّیْ خَالِقٌ بَشَراً مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ (الحجر/۲۸)

تصور کرو اس وقت کا جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں کھنکھن بولتی ہوئی مٹی سے جو سڑی ہوئی مٹی سے بنی ہے۔

دوسری جگہ ہے:

إِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلائِکَةِ إِنِّیْ خَالِقٌ بَشَراً مِن طِیْنٍ. فَإِذَا سَوَّیْتُهُ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِن رُّوحِیْ فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِیْنَ (ص/۷۱)

تصور کرو اس وقت کا جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کرلوں اور اس کے اندر اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔

ایک اور آیت ملاحظہ ہو:

ولقد خلقنا کم ثم صورنا کم ثم قلنا للملئکة اسجدوا لآدم۔ (الاعراف/۱۱)

ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہاری صورت بنائی پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔

سورہ مرسلات میں ہے:

أَلَمْ نَخْلُقکُّم مِّن مَّاء مَّهِیْنٍ. فَجَعَلْنَاهُ فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ. إِلَی قَدَرٍ مَّعْلُومٍ. فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُونَ (المرسلات/۲۳)

کیا ہم نے تمہیں ایک بے حقیقت پانی سے نہیں بنایا، پھر اسے ایک آرام کی جگہ میں رکھا ایک مقرر زمانہ تک، پھر ہم نے اندازہ کیا اور ہم کتنا اچھا اندازہ کرنے والے ہیں۔

یہ اور اس طرح کی بہت سی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان حیوانی منازل طے کرتا ہوا بشریت کے حدود میں نہیں آیا ہے، بلکہ ابتدا ہی سے اسے انسان بنایا گیا ہے۔ کسی غیر انسانی حالت سے قطعاً اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے وہ کسی طبیعاتی انقلاب اور نباتاتی تبدیلی کے سبب حادثاتی طور پر وجود میں نہیں آیا ہے بلکہ اس کا وجود ایک اہتمام، ایک سوچے سمجھے منصوبے اور ایک مقدر عمل کا نتیجہ ہے۔ وہ ایک آزاد اور مستقل وجود کا مالک ہے۔ وہ محض ایک مادی وجود نہیں ہے بلکہ روز اول ہی سے اسے عقل و شعور اور ادارہ وقوت سے نوازا گیا ہے۔ ونفخت فیہ من روحی اس کی واضح دلیل ہے۔ آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ انسان کے اندر جتنی بھی صفات ہیں وہ دراصل صفات الٰہی کا ایک عکس اور پرتو ہیں اور یہی وہ شرف ہے جس کی وجہ سے انسان مسجود و ملائک بنا۔ قرآن کے مطابق انسان کسی ارتقائی عمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی شاہکار تخلیق ہے جسے اس نے اپنے دست قدرت سے بنایا ہے۔ قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَن تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (ص/۷۵) اس کو سب سے عمدہ ساخت پر بنایا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (تین/۴)۔ اس کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (روم/۳۰)

انسان کا مقام و مرتبہ

قرآن مجید نے جس طرح انسان کے وجود کا ایک مثبت اور واضح تصور پیش کیا ہے اسی طرح اس دنیا میں اس کی حیثیت اور مقام و مرتبہ کا بھی تعین کر دیا ہے۔ تخلیق آدم کے اپنے منصوبہ کی اطلاع فرشتوں کو اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں دیتا ہے:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (بقرہ/۳۰)	اور تصور کرو اس وقت کا جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اس آیت میں خلیفہ سے مراد خلیفۃ اللہ ہے۔ گرچہ بعض صحابہ اور تابعین کی رائے یہ ہے کہ انسان دنیا میں اس مخلوق کا نائب اور خلیفہ ہے جو اس کی پیدائش سے قبل زمین پر آباد تھی۔ لیکن متعدد اسباب اور وجود و دلائل کی بنا پر عام علماء اسلام نے اسے خلیفۃ اللہ کے معنی میں لیا

ہے۔ چنانچہ انسان کائنات میں اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کوئی ناقابل التفات اور حقیر شی نہیں ہے، بلکہ وہ کائنات میں سب سے بلند و بالا اور اس کا مرکز و محور ہے، چنانچہ قرآن مجید انسانی کی مرکزیت اور اس کی رفعت کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ. وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفاً أَلْوَانُهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ. وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْماً طَرِيّاً وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (النحل/۱۲-۱۴)

اس نے رات دن اور سورج چاند کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم کے ماتحت ہیں، یقیناً اس میں عقل والوں کے لیے نشانیاں موجود ہیں اور بھی بہت سی چیزیں طرح طرح کے رنگ و روپ میں اس نے تمہارے لیے زمین پیدا کر رکھی ہیں، بے شک نصیحت حاصل کرنے ولاوں کے لیے اس میں بڑی نشانی ہے اور دریا بھی اس نے تمہارے بس میں کر دیے ہیں کہ تم اس سے نکلا ہوا ازہ گوشت کھاؤ اور اس میں سے اپنے پہننے کے لیے زیورات نکالو، تم دیکھوگے کہ کشتیاں اس میں پانی چیرتی ہوئی چلتی ہیں ...اور اس لیے بھی کہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تا کہ تم شکر گذار بنو۔

ایک دوسری آیت میں ہے:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ (الحج/۶۵)

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے زمین کی تمام چیزیں تمہارے بس میں کر دی ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً (البقرہ/۲۹)

اسی نے تمہارے لیے زمین کی تمام چیزیں پیدا کی ہیں۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اس بزم گیتی کا صدر نشیں ہے، وہی اس کا مرکز

ہے، وہی اس کائنات کا گل سرسبد ہے، وہ کائنات کا ساختہ پرداختہ نہیں بلکہ پوری کائنات اس کے لیے بنائی گئی ہے۔ کائنات کی ہر چیز اس کی معاون اور خدمت گذار ہے۔ فطرت کے جملہ قوانین اس کے مفاد اور ضرورت کو پیش نظر رکھ کر بنائے گئے ہیں تاکہ وہ اس کے لیے معین و مددگار ہوں۔

تخلیق آدم کے بعد فرشتوں کا انسانِ اوّل کو سجدہ کرنا، دراصل علامتی حیثیت سے پوری انسانیت کو سجدہ کرنا تھا تاکہ اس کی عظمت و سربلندی کا اظہار ہو سکے۔ غور کیجیے عظمت انسانی کا یہ تصور جو قرآن پیش کرتا ہے، اس کا مقابلہ وہ تصورات کر سکتے ہیں جو فکر جدید کے حاملین نے اس کے متعلق قائم کر رکھے ہیں؟

تخلیق انسان کا مقصد

اب یہاں فطری طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان اتنے اہتمام کے ساتھ کیوں پیدا کیا گیا اور اسے ان عظمتوں اور بلندیوں سے کس لیے نوازا گیا ہے؟ یقیناً اس عظمت و بلندی کا جو انسان کو دی گئی ہے کوئی مقصد ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید نے اسے بھی واضح کر دیا ہے۔ سورہ نحل کی مذکورہ آیات کے آخری الفاظ "لعلکم تشکرون" اس مقصد کو پوی طرح آشکارا کر رہے ہیں، کہ یہ ساری نوازشیں اور عنایتیں صرف اس لیے ہیں کہ انسان اپنے رب کا شکر گذار بنے۔ ایک دوسری آیت میں تخلیق جن وانس کا مقصد عبادت رب بتایا گیا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات/۵٦) — جنوں اور انسانوں کو ہم نے محض عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

یہ شکر اور یہ عبادت دونوں ایک ہی چیز ہیں، یہی انسان کی اصل ذمہ داری، اس کا فریضہ اور اس کا مقصد تخلیق ہے۔ لیکن انسان اپنے فریضہ سے غافل ہو جاتا ہے، بلکہ اپنی عظمتوں کو دیکھ کر خود الوہیت کے زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انسان کے اس رویہ کو قرآن مجید ناشکری سے تعبیر کرتا ہے:

إِنَّ الْإِنسَانَ لَكَفُورٌ (حج ٦٦) — یقیناً انسان ناشکرا ہے۔

قُتِلَ الْإِنسَانُ مَا أَكْفَرَهُ (عبس ۱۷) مارا ہوا انسان کا وہ کتنا ناشکرا ہے۔

اور اس پر یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ وہ اپنے انسانی وجود سے پہلے کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ لم یکن شیئا مذکورا. پھر اسے کھنکھن بولتی مٹی سے نشو ونما کے مختلف مراحل سے گزار کر بہترین ساخت میں انسانی وجود عطا کیا۔ اس کے بعد اسے خلافت فی الارض کے جلیل القدر منصب پر فائز کیا۔ اس طرح قرآن اسے خود ساختہ بلندیوں سے اتار کر پہلے اس کی حقیقت اسے بتاتا ہے، پھر اسے نہایت اہتمام واعزاز کے ساتھ اس بلندی تک پہنچاتا ہے، جہاں اوروں کی رسائی نہیں۔ ایسا اس لیے کرتا ہے تاکہ وہ کسی بیجا احساس کہتری یا احساس برتری میں مبتلا نہ ہو اور اپنی حیثیت اور حقیقت کا صحیح اور حقیقی تصور اس کے سامنے بالکل واضح رہے۔ قرآن اپنے اس اسلوب تفہیم کے ذریعہ نہ اسے حقیر وذلیل بنا کر پیش کرتا ہے اور نہ اسے الوہیت کے قریب میں مبتلا ہونے دیتا ہے، بلکہ اسے اس طرح سواء السبیل کی راہ دکھاتا اور اس کے فریضۂ منصبی سے آگاہ کرتا ہے۔

انسان باشعور و با اختیار مخلوق ہے

جب کائنات انسان کے زیر نگیں ہے، اور انسان مرکز کائنات ہے، وہ یہاں اس لیے آیا ہے تاکہ خدا کی نیابت وخلافت کا فریضہ انجام دے، تو اب اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کو عقل وبصیرت، قوت فیصلہ، اور حق وباطل میں فرق وامتیاز کی صلاحیت سے بھی اسے نوازا جائے، اسے حقائق اشیاء کے ادراک و دریافت کی طاقت وصلاحیت بھی عطا کی جائے۔ چنانچہ تخلیق آدم کے ساتھ ہی اسے اس دولت گرانمایہ سے بھی سرفراز کر دیا گیا۔ قرآن مجید کہتا ہے:

ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلاً مَّا تَشْكُرُونَ (السجدہ/۹)

پھر ٹھیک ٹھاک کر کے اس میں اپنی روح پھونکی اور تمہارے لیے کان آنکھیں اور دل بنائے پر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔

قصۂ آدم میں ہے:

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (بقرہ/۳۱) اور آدم کو تمام اشیاء کے حقائق کا علم دیا۔

ان قوتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اسے ارادہ واختیار سے بھی نوازا گیا ہے تا کہ اپنے علم وشعور کی بنیاد پر جو اقدام وہ کرنا چاہے بے تکلف کر سکے۔ سورہ انعام میں ہے:

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا ... فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ (الانعام/۱۴۸-۱۴۹)	مشرکین کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا شرک میں پڑتے ...اگر وہ چاہتا تو سب کو راہ راست پر لے آتا۔

البتہ اس ارادہ واختیار کے ساتھ کچھ ایسے اسباب ومحرکات بھی اس کی ذات میں فراہم کر دیے گئے ہیں کہ وہ اپنے ارادہ واختیار کو صحیح سمت میں استعمال کر سکے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً (الدہر/۳)	ہم نے اسے راہ دکھادی اب وہ شکر گزار بنے یا ناشکرا۔
وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (البلد/۱۰)	اور ہم نے اسے (خیر وشر کی) دونوں راہیں دکھادیں۔

یہ اور اس طرح کی متعدد آیات ہیں جن سے ایک ایسے باشعور انسان کا تصور ابھرتا ہے جو خیر وشر کی تمیز رکھتا ہے، قوت فیصلہ کا مالک اور حق و باطل میں فرق و امتیاز کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے اور اپنے علم و عقل اور بصیرت و صلاحیت کی بنیاد پر جو فیصلہ اور رائے قائم کرے اس کے مطابق ، بے روک ٹوک عمل و اقدام کا اختیار بھی اس کو حاصل ہے۔ وہ فرشتوں کی طرح مکمل ہدایت یافتہ نہیں ہے کہ کبھی غلطی نہیں کر سکتا، بلکہ نیکی اور بدی کی جس راہ کو اختیار کرنا چاہے، اس کے لیے راستہ کھلا ہوا ہے۔ اس طرح قرآن، انسان کو ایک ذمہ دار اور باشعور مخلوق کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ جس کے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں ہیں اور چاہتا ہے کہ انسان اسے ادا کرے مگر اس کے لیے اسے پابند نہیں بناتا بلکہ اسے آزاد اور خود مختار چھوڑ دیتا ہے۔ کسی ایک ہی راستہ پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کرتا۔ سورہ بقرہ کی درج ذیل آیت

اس سلسلہ میں بہت واضح ہے:

فَإِن زَلَلْتُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (البقرہ/۲۰۹)

پس اگر تم کھلی ہوئی دلیلیں آنے کے باوجود پھسل جاؤ تو جان لو کہ اللہ غلبہ والا اور حکمت والا ہے۔

البتہ خیر وشر میں فرق و امتیاز کا معاملہ صرف انسان کے علم وشعور اور وجدان پر نہیں چھوڑا گیا ہے کیونکہ اسے محدود عقل وصلاحیت دی گئی ہے اس لیے نظام زندگی کا پورا خاکہ قرآن مجید نے اس کے سامنے رکھ کر دیا ہے تاکہ انسان اسی نظام کے مطابق اپنے امور حیات انجام دینے کی کوشش کرے۔

انسان فطری گنہگار نہیں

جنت میں حضرت آدم سے سرزد ہونے والی لغزش کو بنیاد بنا کر بعض مذاہب میں انسان کو پیدائشی گناہ گار قرار دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس قرآن اسے نہ پیدائشی گنہگار کہتا ہے، نہ پیدائشی معصوم عن الخطا، بلکہ اسے ایک با اختیار انسان کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

فَتَلَقَّى آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ . قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعاً فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرہ/۳۷-۳۸)

پس آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں اور اللہ نے اس کی توبہ قبول کر لی بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ہم نے کہا تم سب سے یہاں سے جاؤ۔ جب کبھی ہماری ہدایت تمہارے پاس جائے تو اس کی پیروی کرنے والوں کے لیے کوئی خوف اور غم نہیں۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ غلطی کے بعد جب حضرت آدمؑ نے توبہ وانابت کا اظہار کیا تو ان کی توبہ قبول کر لی گئی، پھر اس کے بعد انہیں زمین پر آنے کا حکم دیا گیا اور جب قبولیت توبہ کے اعلان کے بعد آدم کا زمین پر آنا ہوا تو انسان کے اولین گناہ کا تصور کیسے

صحیح ہوسکتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ تخلیق آدم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے کا اظہار فرشتوں سے کیا تو یہ نہیں کہا کہ میں جنت میں رہنے کے لیے ایک انسان بنانے جا رہا ہوں بلکہ یہ کہا ''میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں'' یعنی حضرت آدم دنیا میں آنے ہی کے لیے بنائے گئے تھے اور منصوبۂ خداوندی کے مطابق اپنے وقت پر یہاں تشریف لے آئے۔ اس سے اس تصور کی بھرپور تردید ہوتی ہے کہ آدم کو کسی گناہ کی پاداش میں دنیا میں بھیجا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قصۂ آدم وشیطان سے کسی پیدائشی گناہ گار انسان کے بجائے ایک صحت مند اور قوی عزم وارادے والے انسان کا تصور ابھرتا ہے۔ جس کا کمال یہ نہیں ہے کہ وہ گناہ نہیں کرتا، بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ گناہ پر قدرت ہونے کے باوجود اس میں ملوث نہیں ہوتا اور اپنا دامن بچا لے جاتا ہے۔ بصورت دگر اپنی غلطی کا اعتراف، ندامت کا اظہار اور مائل بہ اصلاح ہوتا ہے۔

انسان، انسان کا بھائی ہے

قرآن کے نزدیک انسان کی ابتدا انسانِ اول حضرت آدمؑ سے ہوئی ہے، پھر اس کے بعد وہ قبیلوں، نسلوں اور برادریوں میں بٹ گیا۔ اس لیے ایک انسان دوسرے انسان کے لیے بھیڑیا نہیں بلکہ بھائی ہے۔ قرآن مجید کے مطابق، انسان سے تعلق تین اصولوں سے طے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ انسان کی بنیاد ایک مرد اور ایک عورت پر ہے، دوسرے یہ کہ قومیں اور قبیلے پہچان کا ذریعہ ہیں اور تیسرے یہ کہ انسان کی اصل قیمت اس کا کردار ہے، جو صحیح علم اور اچھے عمل سے متعین ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

يَـا أَيُّهَـا النَّـاسُ اتَّقُواْ رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَنِسَاء (النساء/۱)

اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا، اس سے اس کا جوڑا بنایا پھر ان دونوں سے بکثرت مرد اور عورت پھیلا دیئے۔

ایک دوسری جگہ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات/۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری برادریاں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن انسان کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ عالم گیر مساواتِ انسانی پر مبنی ہے، رنگ و خون، نسل و قوم اور زبان وطن کی تفریق کا یہاں گزر نہیں۔ تمام افرادِ انسان شرف انسانی کے اعتبار سے مساوی اور ہم پلہ ہیں۔ کسی کو کسی پر اظہار فضیلت و تفوق کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے جب قبیلہ و خاندان پر فخر و مباہات اور عصبیت جاہلیہ کو ملعون قرار دیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ حاکم و محکوم، آقا و غلام اور اعلیٰ و ادنیٰ کا سارا امتیاز اٹھ گیا اور انسان اپنے اصل مقام پر آ گیا۔ عرب جیسی اجڈ اور جھگڑالو قوم بھائی بھائی بن گئی اور اخوت انسانی کے خوشگوار جھونکوں نے عرب کے تپتے ریگزاروں کو فضائے دلنواز میں تبدیل کر دیا۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَاناً (آل عمران/۱۰۳)

اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی تو تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے۔

جب کہ رنگ، نسل، قوم، وطن اور زبان کی تفریق پر مبنی غلط تصور انسان نے دنیا کو فتنہ و فساد سے بھر دیا اور اسے ایک خوفناک ظلمت کدہ میں تبدیل کر دیا ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الروم/۴۱)

لوگوں کے کرتوتوں کے سبب بحر و بر میں فساد پھوٹ پڑا۔

انسان کی فطرت میں قبول حق کا داعیہ پایا جاتا ہے

اس عالمگیر مساوات انسانی کا تصور پیش کرنے کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ

انسان کی فطرت میں حق و صداقت کو قبول کرنے کا داعیہ بھی رکھا گیا ہے۔ یہ داعیہ وہی عہد و میثاق ہے جو حضرت انسان نے اپنی آفرینش سے پہلے عالم ارواح میں حق تعالیٰ کے ساتھ کیا تھا:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِن بَنِی آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا۔ (الاعراف/۱۷۲)	اور تصور کرو اس وقت کا جب تمہارے رب نے اولاد آدم کی پشت سے اس کی اولاد کو نکالا اور ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں؟ ہم سب گواہ بنتے ہیں۔

یہ داعیہ اس کے تحت الشعور میں ہمیشہ سے موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی انسان کسی آفت و مصیبت میں ہر طرح گھر جاتا ہے تو بے اختیار اس کی زبان پر اپنے خالق و مالک کا نام آجاتا ہے۔ قرآن نے بھی اس کی منظر کشی کی ہے۔

یہی داعیہ انسان کو خدا سے جوڑتا اور اس کی فرمانبرداری پر آمادہ کرتا ہے۔ چونکہ خدا نے اپنی ذات کا شعور فطرت انسانی میں رکھ دیا ہے، اس لیے اس تحت الشعوری احساس کو جگانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل بھیجنے کا اہتمام کیا، جو انسان کو اس عہد و میثاق کی یاد دلاتے ہیں جو انھوں نے اپنے رب سے باندھا تھا اس طرح جب یہ احساس بیدار ہوتا ہے تو وہ انبیاء کی دعوت کو قبول کرتا اور خود کو خدا کے نازل کردہ غیر مبدل اصولوں کا پابند بناتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انبیاء کی ضرورت کا احساس ابھرتا ہے۔

دنیا انسان کا مستقر نہیں ہے

قرآن مجید جہاں انسان کی حقیقت و ماہیت، کائنات میں اس کے مقام و مرتبہ اور اس کے فرائض منصبی پر روشنی ڈالتا ہے وہیں یہ بھی واضح کرتا ہے کہ دنیا کی زندگی ہی اصل نہیں ہے بلکہ اس کے بعد ایک دوسری دنیا اور نیا نظام برپا ہونے والا ہے۔ دنیا کی یہ زندگی محض مہلت عمل ہے جو محدود اور متعین ہے۔ انسان جو کچھ یہاں کرے گا، نئے نظام کے آغاز پر اس کا پورا ریکارڈ

اس کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ اب وہ جیسا کچھ ہوگا اسی کے اعتبار سے اس کی یہ دوسری زندگی خوشگوار یا ناخوشگوار ہوگی۔ کسی کے ساتھ کوئی ظلم وزیادتی نہیں ہوگی۔

اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (غافر/۱۷)	آج کے دن ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا، آج ناانصافی نہیں ہوگی بے شک اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔

قصۂ آدم و شیطان میں قرآن مجید نے یہی دو حقائق بیان کیے ہیں کہ زمین پر ان کا قیام متعین مدت کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت و رہنمائی آنے کے بعد انسان اپنے ارادہ و اختیار سے جو طرز عمل اختیار کرے گا اس کا اسے بدلہ ضرور ملے گا۔ مختصر یہ کہ دنیا انسان کا مستقل اور دائمی مسکن نہیں ہے بلکہ وہ ابدی زندگی کی تمہید ہے۔ الدنیا مزرعة الآخرة.

خلاصہ

حاصل بحث یہ ہے کہ قرآن کا انسان ایک آزاد اور مستقل وجود کا مالک ہے جو اہتمام کے ساتھ ایک مقصد کے تحت پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا وجود تجرباتی ٹھوکروں اور نباتاتی تبدیلیوں کا رہین منت نہیں ہے۔ وہ ایک صاحب عقل وشعور، ارادہ و اختیار کے مالک، حقائق اشیاء سے واقف اور کائنات ارضی کے صدر نشیں کی حیثیت میں زمین پر خدا کی طرف سے بھیجا ہوا اس کا نائب اور خلیفہ ہے۔ وہ انسان اور انسان کے مابین فرق و امتیاز کا قائل نہیں۔ اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے اس کا تعلق محبت، رحمت اور اخوت کا ہے نہ کہ حیوانیت اور بہیمیت کا۔ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے خیر وشر کا ادراک رکھنے والا، خدا کی طرف رجوع کرنے والا اور انبیاء کی تعلیمات سے استفادہ کرنے والا ہے اور اسی تجربہ گاہ عالم میں اپنی مدت عمل سے فائدہ اٹھا کر اپنے رب کے حضور اعزاز واکرام اور اپنی ابدی زندگی کے عیش و آرام کا متمنی اور اس کا طلب گار ہے۔

☆☆☆